اقبال کی اردو شاعری میں ادبی اصطلاحات کا تحقیقی تجزیہ

A Research Analysis of Literary Terms in Iqbal's Urdu Poetry

☆ ڈاکٹر روبینہ یاسمین،(لیکچرار اردو گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج پبی، نوشہرہ
☆☆ ڈاکٹر نیلم،(ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو محکمہ اعلی تعلیم خیبر پختونخوا)
☆☆☆ مصباح(لیکچرار اردو، محکمہ اعلی تعلیم خیبر پختوانخوا)

ABSTRACT:
Allama Iqbal is one of the greatest poet being a poet in Urdu literature. This is a passion and foresight that distinguishes him from other comrades. Iqbal has transformed orthodox words and terminologies into his own unique and eminent style different from the old version. His terminologies not only comprise of implicit deep meanings, but he has devised a real and rank status in the term of every terminology. It will be considerate and genuine efforts to understand his foresight in the vision of his literate terminologies used in Iqbal's poetry style in following article. This article discusses the significance of these terminologies.
Key words; Iqbal, poet, emotion, imagination, meaning, term, unique, literature, Urdu, value, thought

کلیدی الفاظ:
اقبال، شاعر، جذبہ، تخیل، معانی، اصطلاح، منفرد، ادب، اردو، مفہوم، مقام، فکر

علامہ اقبال کی اولین حیثیت ایک شاعر اور ایک عظیم شاعر کی ہے اور وہ جذبہ اور تخیل ہے جو انہیں تمام شاعروں سے ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ اقبال نے بہت سے پرانے الفاظ و اصطلاحات کو ان کے پرانے معانی سے آزاد اپنی ایک الگ اور منفرد صورت عطا کی ہے۔ ان کی اصطلاحات نے ادب کا صحیح مقام اور مرتبہ متعین کیا۔ زیر نظر مقالے میں اقبال کی اردو شاعری میں مستعمل چند ادبی اصطلاحات کے تناظر میں ان کی فکر کو سمجھنے کی کوشش ہو گی. یہ مقالہ اسی اجمال کی تفصیل ہے

اصطلاح عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "ص ل ح" (اصلح) ہے۔ اس کے لغوی معنی مصلحت، رضا مندی اور دوستی کے ہیں۔ یعنی کسی خاص قوم یا جماعت کا کسی لفظ کے ان معانی پر اتفاق کر لینا جو اصل معنی کے علاوہ ہو اصطلاح دراصل خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کرنے والے اشارے ہیں۔ اصطلاح اس مفرد یا مرکب لفظ کو بھی کہتے ہیں جو علمی مطالب ادا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہو، جن کو پورے طور پر بیان کرنے کے لیے لمبی عبارت یا جملے لکھنے پڑتے ہیں۔ بقول سلیم اختر:

،،کسی سائنسی، علمی، ادبی، فلسفیانہ، تنقیدی یا کسی شے یا کسی ایجاد کے لیے جو لفظ مخصوص کر دیا جائے وہ اصطلاح ہے۔ اس لحاظ سے اصطلاحات میں وسعت کے ساتھ ساتھ تنوع بھی ملتا ہے۔

اصطلاح ایک نوع کا ذہنی شارٹ کٹ بھی ہے کہ کسی اصطلاح کے سنتے ہی اس سے
وابستہ تصور خود بخود ذہن میں اُجاگر ہوتا جاتا ہے۔"(۱)

اصطلاح کے لیے انگریزی میں "Term" اور "Terminology" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن کو عام طور پر ایک ہی معنی "اصطلاح" میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنی ذات میں الفاظ صرف لغوی مفہوم کے تابع ہوتے ہیں جب کہ اصطلاح بنتے ہی وہ لغت کی سطح سے بلند ہو کر وسیع اور ہمہ جہت بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ علمی وقار کے حامل ٹھہرتے ہیں۔ اصطلاح کی ضرورت علوم وفنون کی ترتیب، تنظیم، بیان اور تشریح کے لیے پیش آتی ہے۔ فلسفہ، سائنس، ریاضی، تصوف، شماریات، تحقیق اور تنقید یہاں تک کہ ہر نوع کا علم یا فن، جن کی اصطلاحات کے حقیقی حدود کا صحیح ادراک نہ ہو، تحقیق کے مطلوبہ اہداف تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ اصطلاحات پر عبور حاصل کیے بغیر بطور محقق اور منتہی کوئی ٹھوس کام کر سکتے ہیں۔ یوں علوم و فنون، تصورات اور اطلاعات ہمیں اصطلاحات سے حاصل ہوتے ہیں۔ "اصطلاحی جائزے" نام کی تصنیف میں اصطلاحات کی ضرورت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے:

"علوم وفنون کی تعلیم، وتشریح، توسیع اور ترقی کے لیے اصطلاحات کا وجود ناگزیر ہے
بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اصطلاحات علوم وفنون کا محور ہیں۔"(۲)

دیگر علوم کی طرح ادبی میدان میں بھی اصطلاح غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ لہذا یہاں کلام اقبال میں مستعمل چند شعری اصطلاحات کا جائزہ لیا جائے گا۔ اقبال کے ہاں اصطلاحات کا ایک خاصا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ اصطلاحات اپنی نوعیت، اہمیت، افادیت، اور انفرادیت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے مخصوص اصطلاحات کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ اقبال کی اصطلاحات میں مذہبی، دینی، تاریخی وسیاسی اور فلسفیانہ اصطلاحات کے علاوہ ادبی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے اردو کلام میں ادبی اصطلاحات کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں لیکن پہلے سے استعمال ہونے والی اصطلاحات میں انھوں نے ایک نئی جان ڈال دی ہے اور ان کو بالکل ایک نئے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اقبال نے ان ادبی اصطلاحات کو اس خوبصورتی سے اپنے کلام میں سمویا ہیں کہ ایک تو اسے سمجھنے میں آسانی پیدا ہو گئی اور دوسرا ان ادبی اصطلاحات نے ان کے کلام کو پھیکا اور بے مزہ نہیں ہونے دیا، بلکہ ان میں ایک خاص قسم کی شعریت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یوں اقبال نے ادبی اصطلاحات کو اپنے قدیم معنی سے الگ کر کے ان کے بدن کو زندگی کی حرارت سے آشنا کیا ہے اور شاید ہی انہیں اس قدر گہری معنویت میں اقبال کے سوا کسی اور شاعر نے استعمال کیا ہو۔ اقبال کی اردو شاعری میں مستعمل چند ادبی اصطلاحات مندرجہ ذیل ہیں۔

شاعری:

شاعری کے لغوی معنی شعر گوئی، "سخن گوئی" ہیں، جب کہ اصطلاح میں جذبوں کا وہ اظہار جس میں جذبات، تخیل اور اُسلوب کی چاشنی ہو۔

اقبال کو فنون لطیفہ میں شاعری ہی سب سے بہتر نظر آئی ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے اچھی شاعری کی اہمیت کا متعدد بار ذکر کیا ہے۔ اقبال کے خیال میں اچھی شاعری وہی جو زندگی بخش ہو۔ جس میں قوت، حرارت اور جوش ہو۔ انھوں نے خود بھی زندگی کو حرکت و عمل پر مجبور کرنے والی اور عزم و حوصلہ سے آشنا کرنے والی شاعری کی ہے۔ انھوں نے شاعری کو مقصود بالذات نہیں بلکہ اس کے ذریعے انسانی زندگی، کائنات اور تقدیر کے اسرار و رموز کو منکشف کرنے والی نہ صرف سمجھا ہے بلکہ برتا بھی ہے۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں:

ے مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ (۳)

اقبال کی شاعری نہ صرف خارجی محرکات کی تخلیق ہے بلکہ سراسر داخلی جذبے کا اظہار بھی ہے۔ اظہار میں بے ساختگی و روانی، بے تکلفی اور آورد کا گمان ہوتا ہے، جو اہل علم اور صاحبان ذوق کو نئے جذبے سے سرشار کرنے والی ہے۔ بقول علامہ اقبال:

ے مرے گُلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے (۴)

شاعری کو اگر صداقت کا پرتو بنا لیا جائے تو قوم کی حیات اجتماعی میں ایک بڑی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو کر پیغمبری کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کہتے ہیں:

ے کہہ گئے ہیں شاعری جزو یست از پیغمبری
ہاں سنادے محفل ملت کو پیغام سروش (۵)

لیکن یہی شاعری اگر افسردگی، پژمردگی اور حزن و یاس جیسے خیالات و جذبات کا مرقع بن جائے اور ذوقِ حیات کو پس پشت ڈال کر موت کو اپنا موضوع بنائے، روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرے، چشم آدم سے مقامات چھپائے، تعمیر خودی کا فریضہ انجام دینے کے قابل نہ رہے تو ایسی شاعری کو اقبال قابل مذمت ٹھہراتے ہیں۔ کیوں کہ جب کوئی بھی شعبہ خودی کے سوز سے خالی ہوا تو اس میں اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دین اور ادب خودی سے بیگانہ ہوئے، قومیں زوال سے دوچار ہوئیں۔ علامہ کے مطابق:

ے چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار (۶)

ے گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نالے و سرود (۷)

ؔ آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی، بزم سخن ماتم میں ہے (۸)

ؔ سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی (۹)

اقبال کے نزدیک شاعری سمیت تمام فنون لطیفہ کا مقصد ہی خودی کی حفاظت اور اسے مزید استحکام اور مضبوطی بخشنا ہے۔ اعصاب کو سلانے کی بجائے جھنجوڑ کر انسان کو سر گرم عمل بناتی ہو۔ اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری کو روایت سے ہٹا کر ایک نئی آواز، نئے آہنگ اور وسیع تر مفہوم اور وسیع تر معنی میں قوم کے سامنے پیش کیا۔ کیوں کہ ان کے دل میں قوم کا درد تھا۔ اسی درد اور تڑپ نے اقبال کے کلام کو ذکر وفکر و جذب و سرور سے آشنا کیا۔ فرماتے ہیں:

ؔ مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور (۱۰)

ؔ لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں دردِ عشق
بسمل نہیں ہے تو، تو تڑپنا بھی چھوڑ دے (۱۱)

لہذا اقبال بزدلی اور پستی کے جذبات ابھارنے والی شاعری اور ادب سے بے زار ہیں اس لیے وہ ہندوستان کے شاعروں، مصوروں اور افسانہ نویسوں کو روح بیدار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

شعر:

شعر کی اصطلاح بھی علامہ نے اردو کلام میں اپنے مخصوص معنوں میں استعمال کی ہے۔ شعر کے لغوی معنی لغت میں جاننے کے ہیں اور اصطلاح میں کلام موزوں کو شعر کا نام دیا جاتا ہے۔

اقبال سمجھتے ہیں کہ ادب تن اور من کی ضروریات پر نظر رکھے اور جسمانی تقاضوں کے ساتھ ساتھ روحانی تقاضوں کو بھی پورا کرے اور شعر کا مقصد خود کو مفید بنا کر ایک صالح معاشرے کو وجود میں لائے۔

ؔ عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی (۱۲)

اقبال اپنی شاعری کی طرب ناکی کی دلاویزی سے بخوبی آگاہ ہیں۔ فن شعر ان کے نزدیک حظ آفریں و طرب ناک ضرور ہوتا ہے مگر یہ حظ آفرین اس کا مقصد نہیں۔ ان کے نزدیک شعر مزرع ہستی اور انسانیت کے حیات ابدی کا نسخہ ہے۔ اس لیے یہ جذبہ سے سرشار اور زندگی بخش ہو۔ اقبال شعر کو جن مقاصد کا حامل سمجھتے ہیں اس پر اپنی ایک نظم ''شعر'' میں کہتے ہیں:

ؔ میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن

یہ نکتہ ہے تاریخ اُمم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ سرافیل(۱۳)

جو نغمۂ جبریل کی طرح مشیت ایزدی کی تلقین کرتا ہو اور حیات ابدی کا پیغام لیے ہوئے آوازِ حشر کا ساماں ثابت ہو اور یہی وہ شعر ہوتا ہے جس سے غلط وادیوں میں بھٹک کر فنا ہو جانے والے کاروانِ حیات کو ایک بار پھر زندہ کیا جا سکتا ہے۔عہد حاضر میں یہ اجتہاد و امتیاز اقبال کو ہی حاصل ہوا۔اس لیے وہ اپنے زمانے کی فقط بلبل کی آواز اور طاؤس کی رسمی و روایتی معنوں میں اپنے کلام کو محض شعر و شاعری کہنا پسند نہیں کرتے۔

ے چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی (۱۴)

ے ہے شعر عجم گرچہ طرب ناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز(۱۵)

جس شعر میں زندگی کی کارفرمائی نظر آئے اور نہ فن کار کی خودی،وہ اقبال کے نزدیک بے کار اور رجعت پسند ہے۔شعر اگر خودی کی تحفظ کا ضامن نہیں بن سکتا تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا اور نہ اس میں حیا کی قدریں باقی رہ سکتی ہیں۔

غزل:

غزل کے لغوی تعریف "محبوب سے اظہار تمنا اور تعلقات عشق" ہے۔لیکن وسیع سطح پر اب غزل وہ صنف سخن ہے جو غم جاناں ،غم ذات،اور غم دوراں کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اقبال نے بھی اس حقیقت کو روشن تر کر دیا کہ غزل محض عورت کے حسن کی توصیف و تعریف نہیں بلکہ اس کی وسعتیں آفاق گیر اور ان کی لطافتیں بے کراں ہیں اور وہ غزل گو شعرا جو صدیوں سے حسن و عشق اور تصوف و حکمت کی اقدار کی پرستش میں مصروف تھے۔اقبال نے انہیں فرسودہ قرار دے کر غزل کو ایک نئی معنویت سے آشنا کیا۔وہ تصورات جو غیر ارتقائی نظریہ حیات و کائنات اور زوال پذیر تمدن کی فکری اساس پر استوار تھے۔اقبال نے انہیں بالکل ایک نیا ذہنی پس منظر،ایک نئی اور توانا اور متحرک فکری اساس مہیا کی۔""شعر"" اور ""شاعری"" کے ساتھ ساتھ غزل کا ان کا اپنا الگ آہنگ،اپنا لب و لہجہ ہے جو دوسرے شعرا سے منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ان کی غزل سوز و گداز اور لطافت الفاظ و معانی کے محاسن سے مالا مال ہے۔اس لیے تو ابلیس نوجوان مسلم کے دل میں اسلام کی تڑپ پیدا کرنے والے اس عظیم شاعر کو چمن سے نکال دینے کا حکم جاری کرتا ہے:

ے اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو (۱۶)

ابلیس تو اقبال کی غزل کو بلا کی خود اعتمادی، لہجے کی قوت و توانائی، صداقت اور رجائی لب و لہجہ کی بدولت غزل سرائی سے نکال دینا چاہتا ہے تو وہاں ان کی غزل پر اعتراض کرنے والے بھی پیچھے نہ رہے اور ان کی غزل کو غزل ماننے سے بھی انکار کر دیا اور اقبال کی غزل جیسی نازک صنف میں حکیمانہ افکار پیش کرنا ایک آنکھ نہ بھایا۔ ان کی غزل کے انہیں نکتہ چیں حضرات کو فتح محمد ملک یوں جواب دیتے ہیں کہ :

''موہوم لطافت، مجہول نزاکت اور جسمانی احساس تلذذ کے پرستاروں کے یہ گلے شکوے اقبال کی روح معنی اور روح نغمہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ اقبال، اقبال کیوں ہیں، سیماب اکبر آبادی یا نوح ناروی کیوں نہیں۔''(۱۷)

یہی اقبال کی غزل کی انفرادیت ہے کہ ان کی غزل بے مزہ اور خشک افکار و مسائل سے یکسر خالی ہے اور تغزل کے رنگ سے معمور ہے۔

ے یہ کون غزل خواں ہے پر سوز و نشاط انگیز
اندیشہ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز (۱۸)

روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اقبال کی غزل اپنے مجموعی رنگ و آہنگ کی وجہ سے ایک نئی روایت کی تشکیل کرتی ہے ۔ معنی کے علاوہ محاسن کلام کے ظاہری طور طریقوں یعنی لفظی رعایتوں پر بھی قادر ہیں۔ جدت مضامین کے علاوہ حسنِ ادا کی خوبی بھی موجود ہے۔ ان کے ہاں پرانے الفاظ میں بھی نئے معانی مستعمل ہیں۔ اقبال کی غزل میں جہاں سوز ہے تو دوسری طرف نشاط، اور یہی سوز و نشاط کی آمیزش جذبہ حیات کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔

ے میں شاخ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
میرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر (۱۹)

ے اب کیا جو فغاں میری پہنچتی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی (۲۰)

یہی وہ خود اعتمادی ہے جس کی بدولت اقبال خالق کائنات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اپنی اہمیت کا احساس دلاتا ہے اور ان کو پوری کائنات اپنے سامنے سر بسجود نظر آنے لگتی ہے۔

تخیل:

تخیل کی اصطلاح بھی اقبال کے اردو کلام میں خاص معنویت کے ساتھ مستعمل ہے۔ تخیل کے لغوی معنی ''خیال کرنا'' یا خیال میں لانا ہے۔ یعنی سوچ کی کیفیت۔ اس کی اصطلاحی تعریف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی نے اپنی کتاب میں تخیل کی تعریف یوں کی ہے:

''شعر و ادب کی دنیا میں تخیل کے معنی ہیں وہ تخلیقی استعداد جس کے ذریعے فنکار تجربے کے مختلف عناصر کو ایک نئی ہئیت ترکیبی عطا کرتا ہے۔''(۲۱)

تخیل کو شاعری کی جان کہا جاتا ہے کیوں کہ شاعری کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے کائنات بالخصوص فطرت انسانی کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ انسانی زندگی مختلف کیفیات سے ہر روز دوچار ہوتی ہے۔ لہذا ان کو گہری نظر سے دیکھنا اور ان کے پیکر تراشنا اور پھر ان دیکھی چیزوں کے لیے تمثیلی خیال پیش کرنا۔ گویا حسیہ تصویروں کے ذریعے دنیا اور اس کے متعلقات کے بارے میں سوچنا تخیل کے ضمرے میں آتا ہے۔ اردو شاعری میں غالب کے بعد اقبال نے انسان کو جو عزت و مرتبت عطا کی، وہ شاید ہی کسی نے دی ہو۔ اقبال کا انسان محض جنت کا نکلا ہوا درماندہ و پسماندہ اور شرمندہ انسان نہیں بلکہ خود اعتمادی، دولت ایمانی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر کائنات کی ہر شے جو اس کے سامنے آتی ہے، تسخیر کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے فرشتوں سے بڑھ کر مقام پانے والی تخلیات کی یہ ہستی اقبال کے ہاں خدا کو اپنی طنز کا نشانہ بنائے بغیر نہیں رہ سکی۔ فرماتے ہیں:

ے حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں (۲۲)

اقبال کا تخیل، خیالِ محض کے مفردات سے زیادہ موثر، حسین اور کار آمد ہے۔ یہی صحت مند تخیل ہی تھا جس نے اقبال کے دل و دماغ کے پردے چاک کر کے ان کے سوزِ سخن کو ایک نئی زندگی عطا کی تھی۔ تخیل و تفکر کی یہ ہم آہنگی شاعری کی "نوائے پریشاں محرم راز دروں مے خانہ" بن جاتی ہے اور پھر صاحب ساز کو غافل رہنے سے باز رکھتی ہے۔ اہلِ نظر کا ذوقِ نظر شے کی حقیقت کا ادراک حاصل کر لیتی ہے اور شاعر کو ایک باشعور اور دانش ور ذہن کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائے:

ے خدنگ سینہ گردوں ہے اس کا فکر بلند
کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لیے (۲۳)

ے قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرگ چمن کو (۲۴)

لیکن اقبال کے نزدیک وہ تخیل ہی کیا جو صحت مند زندگی سے گریز کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اقبال اس قسم کے شاعر کے تخیل کو رجعت پسند سمجھتے ہیں اور قومی تمدن کے زوال کی نشانی بھی قرار دیتے ہیں:

ے عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار (۲۵)

دورِ حاضر کا تخیل زندگی کا ترجمان نہیں بلکہ مرگِ تخیل کا پیداوار ہے۔ اس لیے اقبال نہایت افسوس کرتے دکھائی دیتے ہیں:

ے کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی (۲۶)

ے اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی

کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی (۲۷)

ہیں اہل سیاست کہ وہی کہنہ خم و پیچ ؎
شاعر اسی افلاس تخیل میں گرفتار (۲۸)

رمز و ایما:

رمز کے لغوی معنی ''اشارہ، علامت، یا نشان'' کے ہیں۔ یہ علمِ بیان کی اصطلاح ہے۔ اسے کنایہ کی ایک توسیعی شکل بھی کہتے ہیں ۔''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' کے مصنف کے مطابق:

''رمزیت سے مراد الفاظ کا ایسا استعمال ہے جو ان کے مفہوم میں سطحی معانی کے علاوہ معانی کے ایک نئے سلسلے کا باعث بن سکے۔ چونکہ رمزیہ عبارت یا اشعار میں الفاظ کی حیثیت اشارات کی سی ہوتی ہے جو معانی کی کسی بلند تر یا لطیف تر سطح کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس لیے رمزیت کے وصف کو اشاریت بھی کہتے ہیں۔'' (۲۹)

اس طرح ''ایما'' کے لغوی معنی بھی ''اشارے'' کے ہیں۔ یہ بھی کنائے کی ہی ایک صورت ہے جس کے تحت شاعر بات کی پوشیدگی سے یوں گزرتا ہے کہ قاری کی لازم سے ملزوم تک بہ آسانی رسائی ہو سکتی ہے۔ اقبال نے رمز کے مقابلے میں ایمائی صورت کو اپنے کلام میں زیادہ استعمال کیا ہے کیوں کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے قوم کی اصلاح کا فریضہ انجام دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں زیادہ ابہام و پیچیدگی والی مثالیں نہیں ملتیں۔

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں ؎
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن (۳۰)

''آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن'' میں انکسار کی بجائے اعتراف عجز سمجھنا چاہیے۔ یہاں اقبال اپنے قارئین کی توجہ خالص فنی تنازعات سے ہٹا کر ندرتِ افکار اور ثروتِ معنی پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ اگر اقبال کو سخن سازی کا فن نہ آتا تو آج وہ دنیائے شاعری میں انقلاب برپا کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے اور نہ اپنے کلام کی فنی عظمت انہیں اردو شعرا میں اس قدر ممتاز مقام عطا کرتی۔ کسی خیال کے ابلاغ کے لیے جو لوگ رمز و ایما کے ادا شناس نہیں یا جنھیں رمزیت کے اسرار و رموز پر غور کرنے کا موقع نہیں ہے تو ان کے سامنے رمز و ایما کے استعمال کا کوئی فائدہ حاصل نہیں رہتا۔

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت ؎
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معنی (۳۱)

لیکن عصر حاضر کو رمز و ایما کی موزنیت اور اثر اندازی کا احساس ہو جائے تو:

جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا ؎
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے (۳۲)

زبان:

''زبان'' کی اصطلاح کو بھی اقبال نے نئے مفہوم میں باندھا ہے۔''زبان'' جس کے لغوی معنی ''بولی، لسان یا لغت'' ہیں جو اصطلاح میں ''قرینہ'' کہلاتا ہے۔یعنی زبان کے استعمال کے دو طریقے ہیں۔ایک تو یہ کہ الفاظ کو اس کے لغوی معانی میں استعمال کیا جائے، اور دوسرا یہ کہ انہیں دلالتی، وضعی یا غیر لغوی معنوں میں استعمال کریں۔الفاظ کو غیر لغوی معنی میں استعمال کرنا مجاز کہلاتا ہے۔جب تک نقاد صاحبِ ذوق نہ ہو وہ معانی مجازی کو پوری دلالتوں میں دریافت نہیں کر سکتا۔اقبال کو شاعری کے لیے ایک ایسے انداز کی ایسی زبان اور ایسا لہجہ وضع کرنا پڑا جن سے شاعری ناآشنا تھی۔بیسیوں الفاظ کو نئی زندگی دی۔اقبال کی شاعری کی زبان میں گہرا تفکر اور سنجیدگی ہے اور ایسے الفاظ جو بھاری بھرکم اور رعب دار ہیں کیوں کہ اقبال مینا و جام کے شاعر نہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق کے نغمہ خواں ہیں۔فرماتے ہیں:

ے نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

ے عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگین بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں (۳۳)

ے ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق (۳۴)

خیالات چاہے کتنے ہی بلند ہوں اگر مناسب شاعرانہ زبان میں ادا نہ کیے جائیں تو وہ اپنی اہمیت اور تاثیر کھو بیٹھتے ہیں۔رفعتِ تخیل کو لطفِ زباں سے کوئی بیر نہیں اور یہ اقبال نے ثابت کر دیا کہ گہرے مطالب کے ساتھ بھی لطفِ زباں موجود ہو سکتا ہے۔اقبال کے عہد میں کچھ شاعر زباں کو بُت کی طرح ماننے والے تھے لیکن اقبال نے اس دور میں بھی صاف اور دوٹوک لفظوں میں صدا بلند کی کہ میں زبان کو بُت بنا کو اس کی پوجا نہیں کرتا بلکہ اسے ثانوی حیثیت دیتا ہوں۔یعنی ان کا تصورِ شاعری نہ جامد ہے نہ مقامی بلکہ دل کشی ہی ان کی شاعری کا اولین جوہر ہے اور یہ جوہر انقلابی الفاظ سے وجود میں آتا ہے۔اس لیے اقبال فرماتے ہیں:

ے نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکُشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی (۳۵)

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی وہ زباں ہے جو روح کو جگاتی اور دل کو گرماتی ہے اور پڑھنے والا لفظوں کے سیلاب میں بہتا چلا جاتا ہے۔ان کی زبان میں جوش ہے، شکوہ ہے، قوت ہے، جلال اور حرکت پائی جاتی ہے۔چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ے روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں (۳۶)

ے وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں

چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں (۳۷)

کب زباں کھولی ہماری لذت گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتش پیکار نے (۳۸)

یوں اقبال نے ''زباں'' کی اصطلاح کو بالکل ایک نئے مفہوم میں استعمال کرتے ہوئے شاعری کی زباں وانداز کے متعلق اپنا موقف واضح کر تے ہیں۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے "شاعری" کو نئی زبان دی۔ اقبال کی ابتدائی شاعری کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات میں پختگی اور فکری بلندی آتی گئی۔ الفاظ و زبان کی پیچیدگی بھی آتی گئی لیکن اس کے باوجود ان کی تاثیر میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس طرح انھوں نے اپنے خیالات کی توسیع کے لیے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا سہارا لیا۔ اور اپنے الفاظ اور اپنی زبان سے مردہ دلوں میں امید کی شمعیں روشن کیں۔

سکوت آموز طول داستان درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے (۳۹)

اقبال نے دنیائے شاعری کو فنی اور فکری دونوں پہلوؤں سے مالا مال کیا۔ وہ دنیا کے سب سے باشعور، باخبر اور صاحب علم شاعر تھے۔ اس لیے بھی اقبال کے ادبی خراج کو نظر میں رکھنا ضروری ہے تاکہ اس سے فن کار کے لیے طریق اظہار کو متعین کرنے میں آسانی مل جائے۔

اقبال کی حکیمانہ اور فلسفیانہ حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے ہی، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بہت بڑے مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے شاعر بھی تھے کیوں کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو کبھی خشک پیچیدہ اور بے مزہ افکار کو شیریں، دل چسپ اور موثر اشعار کی شکل میں نہ ڈھال سکتے۔ اس لیے وہ ایک عظیم ادبی فن کار ہیں اور اسی وجہ سے ان کی مبلغانہ اور واعظانہ شاعری میں بھی خشکی اور بے لطفی پیدا نہیں ہوتی ۔ وہ معمولی لفظوں سے بھی گہرے معانی پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ لہذا وہ جتنے بڑے مفکر تھے اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے۔

انھوں نے اپنے افکار کی توضیح و تشریح نہایت بلیغ اور دل کش انداز میں کی۔ نظم اور غزل میں نئے تجربے کیے۔ انھوں نے نظم نگاری پر خصوصی توجہ دی۔ پرانے نقائص کو دور کیا۔ نئی نئی تشبیہیں اور تراکیب سے اردو شاعری کو مالا مال کر کے اردو ادب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

اچھی شاعری ایک حساس شخصیت کا اظہار ہونے کی وجہ سے سماجی طور پر بھی اچھی ہوتی ہے۔ لیکن اقبال کی شاعری حیاتِ نو کا پیغام دینے کی وجہ سے ادبِ عالیہ میں شمار ہونے لگی اور وہ عالمی شاعری کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ دیگر شعرا کی طرح اقبال خلا میں نہیں لکھ رہے تھے بلکہ وہ ایک عمل پرست شاعر ہیں اور انسان کے سوئے ہوئے شعور کو اپنی شاعری کے ذریعے ہی جگایا اور اس میں ذوقِ سفر پیدا کیا اور اپنی حقیقتِ حال یوں بیان کی کہ شعر و سخن میرا مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درون میخانہ (۴۰)

ان کی ولولہ انگیز شاعری کا یہ ثبوت کم نہیں کہ انھوں نے اسی کے ذریعے عظمت رفتہ کی بحالی کا درس دیا۔علامہ اقبال اپنے دور کے ہی شاعر نہ تھے بلکہ ان کے فارسی کلام کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانے کے، عصر حاضر کے اور آنے والے زمانے کے بڑے اسلامی مفکر ہیں۔افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج کا انسان کلام اقبال سے غافل ہیں۔اقبال کی شاعری کو صحیح معنوں میں مشعل راہ بنانا آج وقت کی اہم ضرورت ہے۔

حوالہ جات

(۱)بحوالہ از، رابعہ سرفراز، ''اقبالؒ کا نظام فن''فیصل آباد، ادارہ قرطاس، ۲۰۰۶ء، ص ۱۷
(۲)عطش درانی، ڈاکٹر ''اصطلاحی جائزے''، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۸ء، ص ۱۲
(۳)محمد اقبال، علامہ، ''کلیات اقبالؒ''(اردو)، لاہور، مکتبہ جمال ۲۰۱۲ء، ص ۶۲۱
(۴)ایضاً ص ۶۱۸
(۵)ایضاً ص ۳۳۳
(۶)ایضاً ص ۱۰۰۹
(۷)ایضاً ص ۹۹۰
(۸)ایضاً ص ۱۴۸
(۹)ایضاً ص ۵۵۰
(۱۰)ایضاً ص ۹۸۴
(۱۱)ایضاً ص ۱۸۴
(۱۲)ایضاً ص ۶۴۸
(۱۳)ایضاً ص ۱۰۱۴
(۱۴)ایضاً ص ۶۴۸
(۱۵)ایضاً ص ۱۰۰۸
(۱۶)ایضاً ص ۱۰۳۱
(۱۷)بحوالہ از ایم اے خالد، ''اقبال کا خصوصی مطالعہ''، لاہور، علمی کتب خانہ، س ن، ص ۳۷۴
(۱۸)محمد اقبال، علامہ، ''کلیات اقبالؒ''(اردو)، لاہور، مکتبہ جمال ۲۰۱۲ء، ص ۵۷۵
(۱۹)ایضاً ص ۷۸۱
(۲۰)ایضاً ص ۳۸
(۲۱)حفیظ صدیقی ابوالاعجاز، ''تفہیم و تحسین شعر''، لاہور، سنگیت پبلیشرز، ۲۰۱۶ء، ص ۳۸
(۲۲)ایضاً ص ۳۴

(۲۳)ایضاً ص۹۵۰
(۲۴)ایضاً ص۹۱۲
(۲۵)ایضاً ص۱۰۰۹
(۲۶)ایضاً ص۱۰۰۴
(۲۷)ایضاً ص۱۰۰۱
(۲۸)ایضاً ص۸۸۸
(۲۹)حفیظ صدیقی ابوالاعجاز، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''،اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء،ص۸۸
(۳۰)محمد اقبال، علامہ، ''کلیات اقبالؒ''(اردو)،لاہور، مکتبہ جمال ۲۰۱۲ء،ص۸۰۵
(۳۱)ایضاً ص۹۹
(۳۲)ایضاً ص۹۹۱
(۳۳)ایضاً ص۱۱۵،۱۱۳
(۳۴)ایضاً ص۹۹۱
(۳۵)ایضاً ص۵۹۰
(۳۶)ایضاً ص۵۶۰
(۳۷)ایضاً ص۸۴
(۳۸)ایضاً ص۶۳
(۳۹)ایضاً ص۱۲۰
(۴۰)ایضاً ص